اسرارِ خودی کی فلسفیانہ بنیاد
یہ توضیحی مضمون علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کی فرمائش لکھا

ترجمہ یوسف سلیم چشتی

پروفیسر بریڈلے[1] لکھتا ہے کہ یہ مسئلہ کہ تجربہ (علم) محدود مراکز سے حاصل ہوتا ہے اور ہمیشہ لفظ ایں وآں کے جامہ میں ملبوس ہوتا ہے، آخر الامر نا قابل تشریح ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ان نا قابل تشریح مراکز سے تجربہ آگے بڑھتا ہے تو انجام کار اس کی فکر ایک ایسی وحدت پر منتج ہوتی ہے جسے وہ ''مطلق'' سے تعبیر کرتا ہے۔ اور جس میں کائنات کے تمام محدود مراکز تجربہ، اپنی اپنی انفرادیت کو مدغم کر دیتے ہیں (قطرے سمندر میں شامل ہو جاتے ہیں)۔ اس لیے بریڈلے کی رائے میں یہ محدود مرکز (اشخاص یا افراد کی خودی) محض شہود یا مظہر ہے۔ اس کی فلسفہ کی مدد سے حقیقت کا ثبوت اس کی ہمہ گیری سے مل سکتا ہے یعنی حقیقت بہ لحاظ ذات خویش محیط کل ہوتی ہے اور چونکہ تمام محدودیت اضافی ہوتی ہے یعنی مطلق کی ضد ہوتی ہے۔ اس لیے فریب نظر ہوتی ہے یعنی کائنات کی ہر شے محدود ہے، اس لیے اضافی ہے۔ اس لیے فریب نظر ہے۔

یہ ہے پروفیسر بریڈلے کا مسلک کہ تجربہ کا ہر محدود مرکز یعنی ہر انفرادی خودی فریب نظر (غیر حقیقی یا باطل) ہے لیکن میں اس فلسفہ کے برعکس یہ کہتا ہوں کہ تجربہ کا یہ محدود مگر نا قابل فہم مرکز (خودی) کائنات کی بنیادی اور اساسی حقیقت ہے۔ یعنی خودی حق ہے[2] حیات سر بسر انفرادی ہے۔ حیات کلی خارج میں کہیں موجود نہیں ہے۔ زندگی جس جگہ بھی نظر آتی ہے کسی شخص یا فرد یا شے میں ہو کر نظر آتی ہے۔ خدا بھی ایک فرد ہے لیکن وہ تمام افراد کائنات میں یکتا اور بے مثل[3] ہے۔ یہ کائنات بقول میک ٹیگرٹ[4] افراد کی ایک انجمن ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے یعنی یہ بات میں اپنی طرف سے کہتا ہوں کہ جو نظم ونسق اور تطابق اس میں پایا جاتا ہے۔ وہ نہ ازلی ہے اور نہ مکمل ہے بلکہ ہماری جبلی یا شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم بتدریج بدنظمی اور انتشار سے نظم وترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول میں ہم سب باہمد گر تعاون کر رہے

ہیں۔اس انجمن کے ارکان کی تعداد معین نہیں ہے۔ نئے ارکان ہر روز عالم وجود میں آتے رہتے ہیں اور کائنات کو مرتبۂ کمال تک پہنچانے کے عظیم الشان کام میں دست تعاون دراز کرتے رہتے ہیں۔ یہ کائنات تکمیل یافتہ (مکمل) فعل نہیں [۵] ہے۔ بلکہ تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہے۔اسی لیے کائنات کے متعلق کوئی بات حتمی اور اذعانی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔فعل تخلیق ہنوز جاری ہے اور جس حد تک انسان اس کائنات کے غیر مربوط حصہ میں نظم و ترتیب پیدا کر سکتا ہے۔اسی حد تک اس کو بھی فعل تخلیق میں مدو معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً فتبارك الله احسن الخالقين یعنی ''پس مبارک ہے اللہ جو سب سے اچھا خالق ہے''۔(۴۱:۳۲)

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کا یہ تصور ہیگل کے جدید انگریز شارحین اور ارباب وحدت الوجود کے خیالات سے بالکل مختلف ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ اپنے آپ کو حیات مطلق یا انائے مطلق میں فنا کر دے (جس طرح قطرہ اپنی ہستی کو سمندر میں فنا کر دیتا ہے) لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین نفی خودی نہیں ہے بلکہ اثبات خودی ہے اور اس کی انفرادیت اور یکتائی جس قدر بڑھتی جاتی ہے اسی قدر وہ اپنے نصب العین سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تخلقوا باخلاق الله یعنی ''اے مسلمانو! تم اپنے اندر خدا کی صفات (کا رنگ) پیدا کرو۔اس طریقہ سے انسان اپنے اندر جس قدر اس یکتا ترین ذات سے مماثلت پیدا کرتا ہے اسی قدر وہ خود بھی بے مثل و یکتا ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ حیات کیا ہے؟ واضح ہو کہ حیات انفرادی شے ہے اور اس کی اعلیٰ شکل (جو تا این دم ظاہر ہوئی ہے) انا (خودی) ہے جس کی بدولت، فرد ایک واحد مستقل اور کافی بالذات مرکز حیات بن جاتا ہے۔جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے انسان، حیات کا کافی بالذات مرکز ہے لیکن وہ ہنوز فرد کامل کے مرتبہ پر نہیں پہنچا ہے۔جس قدر اسے خدا سے دوری ہوتی ہے اسی قدر اس کی انفرادیت بھی ناقص ہوتی ہے۔مکمل انسان وہی ہے جو اقرب الی اللہ ہو لیکن اس کی قربت کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں مدغم کر دے (جیسا کہ فلسفۂ اشراق کی تعلیم ہے) اس کے برعکس وہ خود خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومیؒ نے اس نکتہ کو بہت دلپذیر انداز میں واضح کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایام طفولیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگل میں غائب ہو گئے۔جب ان کی دایہ حلیمہ سعدیہؓ نے اُن کو نہ پایا تو شدت الم سے بدحواس ہو گئیں۔اس پریشانی کے عالم میں جب کہ وہ ان کی تلاش میں سرگشتہ تھیں غیب سے یہ ندا آئی:

غم مخور، یاوہ نگردد او، ز تو
بلکہ عالم یاوہ گردد اندر او

یعنی اے حلیمہ! غمگین مت ہو، وہ گم نہیں ہو سکتے بلکہ ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ سارا عالم اُن ؐ کی ذات میں گم ہو جائے گا۔

مطلب یہ کہ فرد کامل (حقیقی انسان) کائنات میں گم نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ساری کائنات اس میں گم ہو جاتی ہے یعنی وہ ساری کائنات پر متصرف ہو جاتا ہے۔

میں اس منزل سے آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں:

در رضائش مرضی حق گم شود
ایں سخن کے باور مردم شود[6]

یعنی انسان کامل کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کی مرضی میں خدا کی مرضی بھی گم ہو جاتی ہے۔ لیکن اہل دنیا اس راز کو سمجھ نہیں سکتے۔

واضح ہو کہ حقیقی انسان (فرد کامل) اس مادی کائنات ہی کو اپنی ذات میں گم نہیں کرتا بلکہ اس کو مسخر کر لینے کی بدولت اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کو بھی اپنی خودی میں جذب کر لیتا ہے۔ یعنی اپنے اندر خدائی صفات پیدا کر لیتا ہے۔

زندگی ایک ترقی پذیر حرکت جاذبہ ہے یعنی حالت ارتقا میں جس قدر دشواریاں اس کی راہ میں آتی ہیں۔ وہ ان سب کو اپنے اندر جذب کرتی چلی جاتی ہے اور اس کی ماہیت یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی خواہشات اور نئے نصب العین کی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اپنی توسیع اور بقا کے لیے اس نے کچھ ضروری آلات اور وسائل مثلاً حواس خمسہ، قوت مدرکہ وغیرہ پیدا کر لیے ہیں۔ جن کی مدد سے وہ رکاوٹوں اور مزاحمتوں پر غالب آتی رہتی ہے۔[7]

زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یا فطرت ہے۔ لیکن فطرت میں ''شر'' نہیں ہے (جیسا کہ فلسفہ اشراق کی تعلیم ہے) بلکہ اس کا وجود، خودی کی ترقی کے لیے مفید ہے۔ کیونکہ جب خودی، فطرت کی طاقتوں سے متصادم ہوتی ہے تو اسے اپنی مخفی استعدادوں کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ جب خودی اپنی راہ سے تمام رکاوٹوں کو دور کر لیتی ہے۔ تو مرتبہ اختیار پر فائز ہو جاتی ہے۔ اسی لیے خودی بذات خویش کسی قدر مختار ہے اور کسی قدر مجبور۔[8] جب خودی، انائے مطلق (خدا) کا قرب حاصل کر لیتی ہے تو اسے حریت کاملہ نصیب ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیات، عبارت ہے، حصول اختیار کی جدوجہد سے خودی کی غایت یہ ہے کہ وہ ذاتی جدوجہد سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہو جائے۔[9]

خودی اور شخصیت کا تسلسل

انسان کے مرکز حیات کو ہم خودی یا شخص [۱۰] سے تعبیر کرتے ہیں یعنی حیات جب انسان میں جلوہ گر ہوتی ہے تو اسے ہم خودی کہتے ہیں۔[۱۱] نفسیاتی زاویہ نگاہ سے انسانی شخصیت ایک اطنابی حالت [۱۲] کا نام ہے اور اس کا تسلسل اس حالت کے قیام پر منحصر ہے۔ اگر یہ اطنابی حالت قائم نہ رہے تو استرخائی [۱۳] حالت پیدا ہو جائے گی۔ جو خودی کے حق میں مضر ہے۔ چونکہ شخصیت کی اطنابی حالت، انسانی ہستی کا سب سے بڑا کارنامہ یا کمائی ہے۔ اس لیے انسان کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اس حالت کو برقرار رکھے یعنی اپنی شخصیت میں استرخائی حالت پیدا نہ ہونے دے۔ جو شے اس اطنابی حالت کو قائم رکھنے میں ہماری مددگار ہوتی ہے وہی ہم کو غیر فانی بنا دیتی ہے۔ اس لیے شخصیت کا تصور اشیائے کائنات کی قدر و قیمت کا معیار بن جاتا ہے۔ یعنی ہماری شخصیت ہمیں حسن و قبح کا معیار عطا کرتی ہے اور اسی کی بدولت خیر و شر کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ یعنی جو شے ہماری شخصیت (خودی) کو مستحکم کرے وہ خیر (اچھی) ہے اور جو اسے ضعیف کر دے وہ شر (بری) ہے۔ آرٹ [۱۴]، مذہب اور اخلاقیات [۱۵] سب کو خودی ہی کے معیار پر جانچنا چاہیے۔[۱۶] افلاطون پر میں نے جو اعتراضات [۱۷] کیے ہیں۔ وہ دراصل ان تمام فلسفیانہ نظاموں پر وارد ہوتے ہیں جو حیات کے بجائے (موت) (فناء) کو اپنا نصب العین بتاتے ہیں، جو زندگی کے سب سے بڑے مزاحم یعنی مادہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ وراس کو مسخر کرنے کے بجائے اس سے فرار اختیار کرنا سکھاتے ہیں۔

جس طرح خودی یا انا کی آزادی کی بحث میں، مادہ کا مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح اس کی ابدیت (غیر فانیت) کے سلسلہ میں زماں کا مسئلہ لازمی طور سے پیدا ہوتا ہے۔[۱۸] برگساں نے ہمیں بتایا کہ وقت (زماں) کوئی لامتناہی خط نہیں ہے (میں نے لفظ خط کو اس کے مکانی مفہوم میں استعمال کیا ہے) جس سے ہم سب کو طوعاً و کرہاً گزرنا ضروری ہے۔ زمانہ کا یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ اس میں غلط تصورات کی آمیزش ہو گئی ہے۔ واضح ہو کہ زمان خالص میں طول کا تصور داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ یعنی اس کو ہم شب و روز کے پیمانہ سے نہیں ناپ سکتے۔

اپنی شخصیت (خودی) کو غیر فانی بنا دینا یا ابدیت سے ہمکنار کر دینا، یہ ایک امنگ ہے اور اگر اس میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو پھر اس کے لیے جدوجہد کرنا لازمی ہے۔ یہ کامیابی دراصل اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اس زندگی میں خیال اور عمل کے وہ طریقے اختیار کریں جو اطنابی حالت کو قائم رکھنے میں ہمارے ممد و معاون ہو سکیں۔

بدھ دہرم، عجمی تصوف اور اسی قبیل کے دوسرے اخلاقی نظام ہماری اس آرزو کو پورا نہیں کر سکتے۔

لیکن یہ طریقے بالکل بے کار بھی نہیں ہیں کیونکہ مدت دراز تک جدوجہد اور سعی وعمل کے بعد ہمیں قدرتی طور پر، سکون اور خواب آور دواؤں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس قسم کے افکار اور اعمال گویا ہماری زندگی کے ایام کی راتیں ہیں۔ پس اگر ہمارے اعمال وافعال کا مقصد خودی کی اطنابی حالت کا قیام ہو تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ اسے متاثر نہیں کر سکے گا۔ مرنے کی بعد خودی پر استرخائی دور طاری ہوتا ہے جسے قرآن حکیم نے برزخ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ زمانہ حشر تک قائم رہے گا اور اس سکونی یا استرخائی حالت کے بعد صرف وہی اَنا (نفوس) باقی رہ جائیں گے۔ جنہوں نے حیات ارضی میں اپنے آپ کو مستحکم کرلیا ہوگا۔

اگر چہ زندگی اپنی ارتقائی منازل میں تکرار اور اعادہ کو بہت ناپسند کرتی ہے تاہم بقول پروفیسر[۱۹] ولڈن کار، برگساں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق، حشر اجساد بھی قرین عقل ہے۔ جب ہم زماں کو لمحات میں تقسیم کر کے اس میں مکاں کا مفہوم پیدا کر دیتے ہیں تو اسے مسخر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، زماں کی صحیح ماہیت کا علم اس وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب کہ ہم اپنی خودی کی گہرائیوں میں غوطہ لگائیں۔ حقیقی زماں، خود زندگی ہی کا دوسرا نام ہے، اور زندگی بقائے دوام کی صفت حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس مخصوص اطنابی حالت کو قائم رکھ سکے، جس کو اس نے تا ابندم قائم رکھنا ہے۔ جب تک ہم زماں کو ایک مکانی چیز سمجھتے رہیں گے۔ اس کی غلامی سے نہیں نکل سکتے۔ بدستور اس کے محکوم رہیں گے۔ مکانی وقت ایک زنجیر پا ہے جس کو زندگی نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ موجود ماحول کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ دراصل ہم وقت کے غلام یا محکوم نہیں ہیں اور اس کیفیت (یعنی زمان کی غلامی سے آزادی) کا احساس ہمیں اس زندگی میں بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ انکشاف عارضی ہوگا۔

خودی کی تربیت

واضح ہو کہ خودی، عشق سے مستحکم ہو سکتی ہے۔[۲۰] اس لفظ عشق کے مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ اور اس کا مطلب ہے خواہش جذب وتسخیر۔ اس کی اعلیٰ ترین شکل یہ ہے کہ وہ مقاصد اور اقدار کی تخلیق کرتی ہے اور ان کے حصول کے لیے ساعی ہوتی ہے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق ومعشوق دونوں کو منفرد کر دیتا ہے۔ یعنی ان کی شان انفرادیت کو نمایاں کر دیتا ہے۔ جب ایک طالب (مرد مومن) یکتا ترین اور بے مثل (خدا) کے حصول کی کوشش کرتا ہے تو خود اس کے اندر شان یکتائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ضمناً مطلوب کی انفرادیت بھی محقق ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر مطلوب، فرد مستقل بالذات یا مشخص وجود نہ ہو تو طالب کو تسکین کیسے حاصل ہوں گی؟ عشق کسی مشخص یا معین ہستی ہی سے ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص غیر مشخص ہستی سے عشق نہیں کر سکتا۔

جس طرح خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے اسی طرح سوال کرنے سے ضعیف[۲۱] ہو جاتی ہے۔ ہر وہ چیز جو ذاتی کوشش کے بغیر حاصل ہو تحت مقولۂ سوال ہے۔ ایک دولت مند آدمی کا لڑکا جو اپنے والدین کی دولت ورثہ میں حاصل کرتا ہے دراصل سائل (بھکاری) ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی سائل (گداگر) ہی ہے جو دوسروں کے افکار وخیالات کی تقلید کرتا ہے یا ان کو اپنے افکار وخیالات بناتا ہے۔

خلاصۂ کلام اینکہ، استحکام خودی کے لیے ہمیں لازم ہے کہ عشق کی صفت (اطاعت) اپنے اندر پیدا کریں اور ہر قسم کے سوال (گدائی اور تقلید) یعنی بے عملی (کاہلی) سے اجتناب کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کم از کم ایک مسلمان کے لیے تو بلاشبہ اسوہ حسنہ ہے اور حضور کی زندگی سے ہمیں سعی پیہم کا اعلیٰ سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی عمل کی تصویر ہے۔

میں نے اس مثنوی کے کسی دوسرے حصہ میں اشارتاً اسلامی فلسفہ اخلاق کے تمام اصول بیان کیے ہیں۔[۲۲] اور شخصیت کے تصور کے ضمن میں ان کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ خودی کو بے مثل و یکتا ہونے کے لیے تین مرحلے طے کرنا پڑتے ہیں:

(۱) اطاعت قانون الٰہی (قرآن کریم)[۲۳]

(۲) ضبط نفس[۲۴]

(۳) نیابت الٰہیہ

نیابت الٰہی اس دنیا میں ارتقائے انسانی کی تیسری اور آخری منزل ہے، نائب حق، خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ وہ کامل ترین خودی ہے جو بنی آدم کا نصب العین ہے اور زندگی کی روحانی معراج[۲۵] ہے۔ نائب حق کی زندگی میں حیات نفسی کے متضاد عناصر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور اعلیٰ ترین قوت، اعلیٰ ترین عمل سے متحد ہو جاتی ہے یعنی اس کی زندگی میں ذکر اور فکر، خیال اور عمل، عقل اور جبلی خواص سب ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ نخل انسانیت کا ثمر آخریں ہے اور ارتقائے حیات کی تمام صعوبتیں اور تلخیاں اس لیے گوارا ہو سکتی ہیں کہ ان کا آخری انجام اس کی شکل میں ظاہر ہونے والا ہے۔ وہ بنی نوع آدم کا حقیقی حکمران ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی حکومت دراصل اللہ کی حکومت ہوتی ہے۔ وہ اپنی فطرت کے خزانہ سے دوسروں کو زندگی کی دولت عطا کرتا ہے اور اپنے قریب تر لاتا جاتا ہے۔ ہم جس قدر منازل ارتقاء طے کرتے جاتے ہیں، اسی قدر اس کے قریب ہوتے جاتے ہیں اور اس کا قرب حاصل کر کے اپنے آپ کو میزان حیات میں بلند کرتے ہیں۔

نائب حق کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسانیت، جسمانی اور دماغی دونوں پہلوؤں سے ارتقائی منازل طے کر لے۔ فی الحال اس کا وجود صرف ہمارے ذہنوں میں ہے۔ خارج میں کہیں نہیں ہے۔ لیکن

انسانیت کا ارتقا ایک مثالی قوم کے ظہور پذیر ہونے کی خبر ضرور دے رہا ہے جس کے افراد کم و بیش یکتا انفرادیت کے حامل ہوں گے یعنی ان میں یہ صلاحیت ہوگی کہ نائب حق ان میں پیدا ہو سکے۔ پس زمین میں خدا کی بادشاہت کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں ایسی جمہوریت قائم ہو جائے جس کے افراد کم و بیش یکتا ہوں اور اس جمہوری نظام کا صدر (میر مجلس) وہ شخص ہوگا جسے نائب حق یا انسان کامل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ انسان کامل کمال کے آخری نقطہ پر فائز ہوگا۔ جس کے اوپر اور کوئی نقطہ متصور نہیں ہوسکتا۔ نطشے (مشہور جرمن فلسفی) نے اپنے تخیل میں ایسی مثالی قوم کی ایک جھلک ضرور دیکھی تھی لیکن اس کی دہریت اور امارت پسندی نے اس کے سارے فلسفہ کو مسخ کر دیا یعنی اس کے سارے تخیل کو دھندلا کر دیا۔[۲۷]

حوالہ جات و حواشی

۱- پروفیسر بریڈلے آکسفورڈ کا مشہور فلسفی ہے۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔ ۴۲ سال کی عمر میں یونیورسٹی کالج آکسفورڈ سے فلسفہ کی ڈگری لی اور تادم وفات اسی یونیورسٹی سے وابستہ رہا۔ تصانیف کا سلسلہ ۱۸۷۴ء سے ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔ لیکن اس کی شہرت کی بنیاد شہود و حقیقۃ پر ہے جو ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں اس کا ترجمہ جرمن میں ہوا۔ بریڈلے موجودہ دور میں کرین اور کیئرڈ کے بعد تیسرا فلسفی ہے جس نے انگلستان میں فلسفہ تصوریت وحدۃ الوجود کو فروغ دیا۔ یعنی وہ بھی ہیگل کا متبع ہے اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف انائے مطلق فی الحقیقت موجود ہے۔ یہ کائنات محض فریب تخیل یا دھوکہ ہے گویا شنکر اور ابن عرفی کے فلسفہ کی صدائے بازگشت ہے۔

۲- چنانچہ اقبال نے گلشن راز جدید میں اپنا مسلک یوں بیان کیا ہے:

خودی را حق بداں باطل مپندار   خودی را کشت بے حاصل مپندار

۳- امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور یہ مسلک سورۂ اخلاص کی آخری آیت ولم یکن له کفوا احد سے مستنبط ہے۔

۴- ڈاکٹر میک ٹیگرٹ کیمبرج کا مشہور فلسفی اور حضرت علامہ کا استاد تھا۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔ بریڈلے کے بعد ہیگل کا سب سے بڑا متبع اور شارح تھا۔ اس کی تصانیف میں ہیگل کے منطق کی شرح بہت اعلیٰ درجہ کی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اس نے اپنے استاد سے اکثر مسائل میں اختلاف بھی کیا ہے جس کی تفصیل اس کی تصنیف ماہیۃ وجود میں مل سکتی ہے۔

۵-

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

۶- یہ مصرع مولانا رومی کا ہے۔

۷-

آرزد صید مقاصد را کمند دفتر افعال را شیرازہ بند

۸- ارشادِ نبوی ہے کہ الایمان بین الجبر والاختیار

چنیں فرمودۂ سلطان بدر است کہ ایماں درمیان جبر و قدر است

۹-

بر مقام خود رسیدن زندگی است ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

گر نہ بینی، دین تو مجبوری است ایں چنیں دین از خدا مہجوری است

۱۰- اس سے معلوم ہوا کہ اقبال کے فلسفہ خودی اور شخص مترادف ہیں، اندریں حالات کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ خودی سے تکبر یا غرور مراد ہے۔

۱۱- یعنی انسان کی خودی، حیات کی انتہائی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔

۱۲- اطناب (Tension) کا ترجمہ ہے اور اس سے مراد نفس یا خودی کی وہ حالت ہے جب اسے اپنی ہستی کا احساس بہت قوی ہو۔

۱۳- استرخاء (Relexation) کا ترجمہ ہے جو اطناب کی ضد ہے یعنی نفس ناطقہ یا خودی کی وہ حالت جب اسے اپنی ہستی کا احساس بہت ضعیف ہو۔

۱۴- یعنی وہی آرٹ لائق تحسین ہے جس کی بدولت ہماری خودی مستحکم ہو سکے۔

۱۵- یعنی غلاموں کا فلسفۂ اخلاق خودی کو ضعیف کر دیتا ہے۔ کیونکہ غلام قومیں عاجزی، انکساری اور خاکساری کو بہترین اخلاق قرار دیتی ہیں۔

۱۶- عربی شاعری پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتراضات کی زیر عنوان ۱۹۱۶ء میں اقبال نے انگریزی رسالہ نیو ایرا میں یہ لکھا تھا کہ ''انسانی جدوجہد کا آخری مقصد زندگی ہے ایک شاندار کامیاب اور طاقتور زندگی۔ اس لیے میں تمام انسانی آرٹ کو اسی آخری مقصد کے تحت رکھنا چاہتا ہوں اور ہر شئے کی قیمت اس کی زندگی بخش قوت کے لحاظ سے معین کرتا ہوں۔ جو آرٹ ہمارے اندر قوت پیدا نہیں کرتا میری نگاہ میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اسی لیے اعلیٰ یا بہترین آرٹ وہ ہے جو ہماری خفتہ قوت عمل کو بیدار کر دے اور ہمیں مشکلات زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لائق بنا دے۔

ہر خواب آور چیز جو ہمیں ان حقائق سے غافل کر دے جن کے مسخر کرنے پر زندگی کی کامیابی کا انحصار ہے وہ زاول اور موت کا پیغام ہے۔ آرٹ میں افیون خورانیدن کا رنگ نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی آرٹ کا اثر ہمارے دل و دماغ پر وہ نہیں ہونا چاہیے جو افیون کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ تحصیل فن بغرض فن کا اصل دور انحطاط اور پستی کی ایجاد ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ ہم حیات اور قوت دونوں سے محروم ہو جائیں۔

۱۷-

راہب اول افلاطون حکیم   از گروہ گوسفندان قدیم

۱۸-

سبز بادا خاک پاک شافعی   عالمے سرخوش ز تاک شافعی

۱۹- پروفیسر فلسفہ کنگس کالج، لندن ۱۹۳۱ء میں وفات پائی۔

۲۰-

از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

۲۱-

از سوال آشفتہ اجزائے خودی   بے تجلی نخل سینائے خودی

۲۲- اسرار خودی۔

۲۳- ایضاً۔

۲۴- ایضاً۔

۲۵- ایضاً۔

۲۶- اقبال نے اسلامی جمہوریت کے عنوان کے تحت نیو ایرا بابت ۱۹۱۶ء، ص ۲۵۱ پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یورپ کی جمہوریت جس پر اشترا کی ہنگامہ آفرینی اور لاقانونیت کا خوف مسلط ہے یورپین جماعتوں کے معاشی نشاۃِ ثانیہ کی بدولت پیدا ہوئی۔ فی الجملہ نطشے اس ''سلطانی جمہور'' سے سخت متنفر ہے اور چونکہ وہ عوام کی ذہنیت اور صلاحیت سے بالکل مایوس ہے اس لیے وہ اعلیٰ ثقافت کو فوق البشر افراد کی امارت مآب جماعت کی تربیت پر منحصر کرتا ہے لیکن میں نطشے سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا عوام واقعی ناکارہ ہیں؟ کیا اُن میں ترقی کی مطلق استعداد نہیں ہے؟ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے بھی دنیا کو ایک جمہوری نظام سے روشناس کیا تھا۔ مگر جمہوری نظام، معاشی تقاضوں کی توسیع کی بدولت ظہور میں نہیں آیا۔ بلکہ وہ ایک روحانی اصل یا طریق کار ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہر فرد بشر میں غیر محدود ترقی کی استعداد مخفی ہے اور اگر وہ ایک خاص قسم کی سیرت پیدا کر لے تو اس کی وہ تمام مخفی استعدادیں قوت سے فعل میں منتقل ہوسکتی ہیں۔ اسلام نے تو عوام ہی کی ایسی اعلیٰ تربیت کی کہ اُن سے بہترین کردار کے افراد پیدا ہوئے یعنی دنیا نے زندگی اور طاقت کے بہترین نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ پس میری رائے میں صدرِ اسلام کا جمہوری نظام، نطشے کے تصورات کی ایسی تردید ہے جو تجربہ پر مبنی ہے۔